قرآنی نظریہ سلطنت

اُس کے مقدمات اور اسکی روح

(۲)

از پروفیسر ہارون خان شروانی ایم اے (آکسن) بار ایٹ لا استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ
ترجمہ جناب مولوی سعید الحق صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں قرآنی نظم سلطنت (Polity) کی روح سے بحث کی جا سکتی ہے، اور جہاں بالفعل تقابل اور موازنہ کئے بغیر ہم سیاسیات عالم کے اس ارتقاء کو ٹھیک سمجھ سکتے ہیں جس کا ظہور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ ابتدا میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس محدود بحث میں ہم حدیث کے اس وسیع ذخیرہ سے استفادہ نہ کر سکیں گے۔ جو ہمارے پاس پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے متعلق معلومات کا ایک اہم ماخذ ہے، اگرچہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ آج تک کسی انسان کی زندگی کو اس کے ہمعصروں اور اس کے اخلاف نے اس قدر تفصیل اور ایسی صحت کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا ہے جس کے ساتھ اس ہستی کی زندگی محفوظ رکھی گئی ہے جس نے دنیا کے سامنے قرآن کو پیش کیا قرآن مجید ہدایات اور احکام پر مشتمل ہے جو بعض مقامات پر نہایت مفصل اور بعض مواقع پر بہت مجمل ہیں، اور جگہ جگہ ان میں تاریخی واقعات کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم زیادہ تر اس کتاب کے سیاسی پہلو سے بحث کریں گے اور اس کے ساتھ جہاں کہیں کوئی تاریخی

اشارہ ہوگا وہاں دوسرے مشہور و مستند مآخذ سے اصل عبارت کی تشریح کر دیں گے۔

رسول اللہ کے سیاسی کارنامے اس کام کے آغاز سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی کا ایک نہایت مختصر خاکہ ابتدائے نزول وحی سے لے کر آپ کے وصال تک بیان کر دیا جائے، جو ۲۳ قمری سنین پر مشتمل ہے۔ آپ کی عمر چالیس سال کی تھی جب آپ پر مکہ سے دو میل دور ایک سنسان غار میں وہ قابل غور آیت نازل ہوئی جس میں ایک امی محض انسان سے کہا گیا تھا کہ "تو پڑھ" اور جس میں ایک طرف انسان کی حقیر اصل اور دوسری طرف انسانی بزرگی و برتری کے سرچشمے یعنی علم کی اہمیت بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کی گئی تھی[۱]۔ قرآن کا اصل مقصد یہی تھا کہ اصول فطرت کی تبیین کے ساتھ حقائق کا علم بخشے۔ اس کی تمام ہدایات کا مبنیٰ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے انسان پر کائنات کے ابدی قانون کے اسرار منکشف ہوں، اور غالباً اسی مطمح نظر کے لحاظ سے اس طریق زندگی کو جس کی طرف قرآن نے رہنمائی کی ہے، "قدیم" بھی کہا گیا ہے اور "غیر متبدل" بھی[۲]۔

اسلامی سلطنت کے اساسی اصول بیعت عقبۂ اولیٰ و ثانیہ کے ان میثاقوں میں امتیازی نشانات کے ساتھ نظر آتے ہیں جو سنہ ۶۲۱ء اور سنہ ۶۲۲ء میں لیے گئے تھے۔ انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ ان نہایت اہم بیعتوں میں سے پہلی بیعت چند مٹھی بھر اشخاص (صرف ۱۲ آدمیوں) سے لی گئی تھی جو مکہ کے باہر پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی خدمت

---

۱ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (قرآن سورۂ علق)۔

۲ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (الروم: رکوع ۴)۔

میں حاضر ہوئے تھے۔ ایک بے یار و مددگار انسان ایک خار دار درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ان چند آدمیوں سے اس امر پر بیعت لے رہا تھا کہ وہ کائنات کے غیر متبدل قانون کی پیروی کریں گے، خدا کے سوا کسی کی پیروی نہ کریں گے، چوری اور زنا اور قتل اولاد اور افتراء سے مجتنب رہیں گے اور ہر حال میں وفاداری پر قائم رہیں گے، خواہ خوشحالی ہو یا تنگ حالی[۱]

اس میثاق میں اس تزکیۂ نفس، اصلاح تمدن اور محکم قانونی تدبیر کے ابتدائی جراثیم چھپے ہوئے ہیں، جو بعد میں پوری قوت کے ساتھ روبعمل آنے والی تھی۔ اس کے دو سال بعد دوسری بیعت کے موقع پر اس امر کا قطعی عہد لیا گیا کہ وہ ہر چیز میں رسول خدا کی اطاعت کریں گے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے اس امر کی تصریح فرمائی کہ آپ کا مفاد اور ان کا مفاد ایک ہے[۲] اسی سال اہل مکہ کی ایذا رسانی اور ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمانوں کی مختصر سی جماعت اپنے ہادی و پیشوا کی معیت میں امن و سلامتی کی اس جنت کی طرف ہجرت کر گئی جس کا نام یثرب تھا اور بعد میں مدینۃ النبی یا اختصار کے ساتھ صرف مدینہ کے نام سے موسوم ہوا۔ وہاں مواخاۃ کے انتہائی حکیمانہ طریقہ کو اختیار کر کے اس جلیل القدر اسلامی برادری کی بنیاد رکھی گئی جو نسلی، لسانی اور جغرافی امتیازات سے قطعاً بیگانہ تھی۔ اس میں مکہ سے آئے ہوئے مہاجر اور ان کے مدنی مددگار (انصار) بالکل ایک دوسرے کے بھائی بھائی بنا دیے گئے[۳]

---

[۱] ابن ہشام جلد اول حصہ اول۔ (تہذیب و تحشیۂ وستنفیلد) ص ۲۸۸۔

[۲] 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۲۹۷۔

[۳] 〃 〃 〃 〃 ص ۳۴۴۔

مدینہ میں مسلمانوں کو مقامی یہودیوں سے معاملہ کرنا تھا۔ اس نوزائیدہ ریاست کو نہ صرف ان کا لحاظ کرنا پڑا بلکہ مدینہ کے مسلم باشندوں کو بھی اپنی حفاظت و حمایت میں لینا پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست پیش بینی اور سیاسی تدبیر اس عہدنامہ میں نظر آتی ہے جو آپ نے یہودیوں کو عطا کیا۔ اس میں منجملہ دوسرے امور کے یہ تصریح کی گئی تھی کہ یہودی بھی اس نئی ریاست کے ویسے ہی "وطنی" (Citizen) ہوں گے جیسے مسلمان ہیں؛ اہل یثرب کی یہ دونوں شاخیں مل کر ایک مرکب قوم بنائیں گی۔ مجرم کو سزا دی جائے گی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، ضرورت کے وقت دونوں پر ریاست کی مدافعت کا فرض عائد ہوگا، اور آئندہ جو نزاعات پیش آئیں گی ان کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے[1]۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اگر وہ لوگ جن کو نبی صلعم نے اس طرح اپنی حمایت میں لیا تھا، اپنے قول پر قائم رہتے تو آزادی ضمیر اور مشترک وطنیت کا یہ پروانہ اپنی جگہ بدستور قائم رہتا۔ مگر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہودیوں نے گردن کشی شروع کر دی اور نوخیز ریاست کے مقابلہ میں عین اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے جب کہ اس کا وجود ملکی غارت گروں کے حملے سے خطرے میں مبتلا تھا۔

پیغمبر اسلام (علیہ السلام) نے بے خوف و خطر ایک دوسرا پروانہ آزادی نجران کے عیسائیوں کو عطا کیا جس میں ان کو جان، مال اور دین کی امان دی گئی تھی اور ان کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ انھیں اپنے مذہبی اعمال میں پوری آزادی حاصل ہوگی، کوئی قسیس راہب اور پادری اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، کوئی تمثال یا صلیب نہ توڑی جائیگی

---

[1] ابن ہشام جلد اول صلا ۳۴۲۔

کوئی عُشر اُن پر عائد نہ کیا جائے گا۔ اور نہ کبھی ان سے فوج طلب کی جائے گی[1]۔

تاریخ گواہ ہے کہ یہ عہدنامے محض اس وجہ سے باطل ہوئے کہ یہودیوں نے اور ان کی پیروی میں عیسائیوں نے خود ان کی خلاف ورزی کی۔ اسی طرح نبی صلعم کو غسان کے عیسائیوں کے خلاف ایک فوج صرف اس وجہ سے بھیجنی پڑی کہ انہوں نے ایک سفیر کو جو مدینہ سے بھیجا گیا تھا، بے گناہ قتل کر دیا۔ بہرحال اس معلم حکمت و سیاست نے اپنی وفات سے پہلے تمام مخالف طاقتوں کو مغلوب کر لیا اور تمام عرب کو ایک حکومت اور ایک قانون کے تحت جمع کر دیا۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس سے اس ملک کی تاریخ کبھی آشنا نہ ہوئی تھی یہ سیاسی معجزہ اُن ہزارہا بندگان خدا کے افکار و اعمال کی کامل وحدت میں نمودار ہوا جو حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ کو سننے کیلئے جمع ہوئے تھے۔ یہ خطبہ جو ۷ مارچ ۶۳۲ء کو عرفات کے میدان میں دیا گیا تھا[2]، انسانی تاریخ کے اہم ترین اعلانات میں سے ایک ہے اور درحقیقت وہ نہایت فخر کا موقع تھا جب خدا کے رسول نے اعلان کیا کہ جو کام صرف ۲۰ سال پہلے شروع کیا گیا تھا وہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے ٹھیک دو مہینے بعد اس مبلغ اعظم نے ۸ جون ۶۳۲ء کو انتقال فرمایا۔

قرآن میں سیاسی استدلال کا طریقہ جس شخص نے عملاً پوری نوع بشری کے طرز زندگی کو بدل دیا، اس کے چند اہم ترین سیاسی کارناموں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اب ہم آسانی کے ساتھ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر بحث کر سکتے ہیں۔

---

[1] واقدی بحوالہ میور: "لائف آف محمد" ج ۲ ص ۲۹۹، نیز فتوح البلدان للبلاذری۔ ذکر صلح نجران۔ مجھے طبقات ابن سعد میں اس صلح کا حال نہیں ملا۔

[2] ابن ہشام جلد اول۔ حصہ چہارم۔ ص ۹۶۸۔

ابتداءً یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں سیاسی استدلال کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ تاریخی طریقہ ہے۔ نہ صرف عام ہدایات و احکام کی توضیح کے لیے عرب اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی تاریخ سے نظائر پیش کیے گئے ہیں، بلکہ جہاں اس کتاب میں کوئی مجرد خیال (Abstract notion) پیش کیا گیا ہے وہاں بھی قریب قریب ہر موقع پر توضیح و تشریح کے لیے ان اقوام کی تاریخ کے نتائج سے استشہاد کیا گیا ہے جن سے اہل عرب واقف تھے، مثلاً عاد و ثمود اور اہل مصر و فلسطین اور روم، عراق و فارس۔ قرآن واضح طور پر قدیم بادشاہیوں اور دوسری قوموں کے حالات میں امتیاز کرتا ہے، اور ہر ایک کے مخصوص اسباب زوال سے بحث کرتا ہے تاکہ وہ بعد والوں کے لیے سبق ہوں۔ مثال کے طور پر قدیم بادشاہیوں میں سے مصر کو بجا طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ وہ ایک نہایت قدیم اور نہایت طاقتور سلطنت ہونے کے ساتھ ایک ایسی سلطنت ہے جو اس وجہ سے پارہ پارہ ہو گئی کہ اس نے انسان کی بے حقیقتی اور قانون خداوندی کی قدرت کاملہ سے، جس کا انکشاف چند برگزیدہ ہستیوں پر ہوا تھا، سخت تغافل برتا۔ موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو فرعون مصر کے پاس اس لیے بھیجا گیا کہ اس نے قانون الٰہی کے خلاف سرکشی اختیار کی تھی (اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ طٰہٰ: رکوع ۲) اور اس قانون سے بے پروا ہو کر زمین میں ظلم و استبداد شروع کر دیا تھا۔ (وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ۔ یونس، رکوع ۹)۔ اس کے جرائم میں سے ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ پوری قوم کا نمائندہ بننے کے بجائے اس نے قوم کو بہت سے فرقوں میں تقسیم کر کے ایک فرقہ کو برگزیدہ اور دوسرے فرقہ کو ظلم و ستم سے پامال کیا۔ (اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ

القصص ۔ رکوع ۱) اس طرح اس نے خدا کی مخلوق کو تفریق و استعباد (Divide and rule) کے اس غیر فطری اور غیر انسانی طریقہ سے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جو عارضی طور پر کچھ مدت کے لیے تو کار آمد ہو سکتا ہے، مگر ٹھیک اسی آن ناکام ہو جاتا ہے جس آن لوگوں میں بشری وحدت کا احساس، اور اس تقسیم و تفریق کے نقصان کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ سے نظائر پیش کرتے ہوئے قرآن بتاتا ہے کہ خدا نے ان پر اپنے انعامات کی بارش کی، ان کے لیے خود انہی میں سے نہ صرف انبیاء پیدا کیے بلکہ ان کو بادشاہ بھی بنایا[1]، اور جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات کے بعد وہ اپنے وطن سے نکالے گئے اور ان پر ظلم کیا جانے لگا تو ان کو طالوت کی ذات میں ایک بادشاہ عطا کیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے ضمناً ایک اعلیٰ درجہ کے امیر (ڈکٹیٹر) کی خصوصیات کس خوبی کے ساتھ بیان کی ہیں یعنی علم اور طاقت[2]۔ یہ قاعدہ آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا ہزارہا برس پہلے تھا۔

قومی زوال کے اسباب | قرآن مختلف قوموں کے واقعی طرز حکومت سے بحث کیے بغیر عمومی طور پر

---

[1] وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (المائدہ: رکوع ۴)

[2] اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۔۔۔۔ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۔۔۔۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (بقرہ: ۳۲)۔

قوموں کے اسباب زوال بیان کرتا ہے اور یہ عظیم الشان قاعدۂ کلیہ پیش کرتا ہے کہ:-

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد: ۲) — خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے نفس کی کیفیت کو نہیں بدلتی۔

کائنات کے قوانین بجائے خود ظالمانہ نہیں ہیں۔ ہر قوم کو ابتدا میں کردار صحیح کے حدود بتا دیے گئے ہیں اور ان حدود سے تجاوز ہی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو گرا کر ایک دوسری قوم اٹھائی جاتی ہے[1] اور یہ قانون فطرت ہے کہ انسانی افراد کی طرح انسانی جماعات کی بھی زندگی و موت ہوا کرتی ہے جب کسی قوم کی بیماریاں علاج کی حد سے گذر جاتی ہیں، تو افراد انسانی کی طرح وہ بھی ایک بندھے ہوئے قانون کے تحت مر جاتی ہے اور ایک نئی اور زیادہ طاقتور قوم کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے[2]۔

حکومت الٰہی اور اس کے نتائج یہ بات معلوم و معروف ہے کہ قرآن توحید خداوندی کی تعلیم اور زمین پر خدا کی بادشاہی کے ذکر سے لبریز ہے[3]۔ اس اصل الاصول میں تین متمیز تصورات شامل

---

[1] وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (یونس: ۲)۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ ... وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ (انبیاء: ۲)۔

[2] لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (یونس: ۵)۔

[3] مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:- قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ (آل عمران: ۳) وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران: ۱۹) قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ... قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (المومنون: ۵) اَلَا اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور: ۹) وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید: ۱) يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (الطلاق: ۲) تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (الملک: ۱) اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (والتین)۔

ہیں جو اس کتاب کے سیاسی پہلو سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ توحید خداوندی اپنی عین فطرت کے لحاظ سے وحدت قانونی کو متضمن ہے، اور جیسا کہ قرآن واضح طور پر بتاتا ہے، اس کے قانونی تصورات، کائنات کے اٹل قوانین کلیہ پر مبنی بلکہ ان کے ساتھ متحد الاصل ہیں،[1] اس لیے یہ قانونی وحدت انہی تصورات پر مبنی ہونی چاہیے۔

۲۔ دوسری چیز جس کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ جس طرح ایک بادشاہ کی رعایا کے تمام افراد اس کے ساتھ تعلق رکھنے میں یکساں ہیں اسی طرح خدا کی بادشاہت بھی یہ معنی رکھتی ہے کہ نوع انسانی کے افراد اس کی نسبت سے لازماً ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ انسان قانون کلی (Universal Law) کے مقابلہ میں قطعاً بے بس ہے، اور جس چیز کو قانون سازی کہا جاتا ہے اس کے دائرہ میں انسان کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قانون کلی کے رموز و اسرار کو سمجھنے اور دریافت کرنے کی کوشش کرے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک سائنس داں قوائے طبیعی کا انکشاف کرنے اور ایک ماہر معاشیات انسان اور معاشی ثروت کے درمیان فطری تعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قانون کلی کی حکومت میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ جو لوگ اس کو تسلیم کریں، یا کم از کم اس کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہو جائیں، وہ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ ہوں، مگر جو اس کی حدود سے تجاوز کریں وہ اسی طرح سلطنت کی حمایت سے محروم ہو جائیں جس طرح آج کل قانون کی

---

[1] فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (الروم: ۴)۔

حد سے تجاوز کرنے والے، سزا، قید، جرمانہ، حتّٰی کہ قتل تک کے متوجب ہو جاتے ہیں۔ خدا پورے جہان کا حقیقی فرمانروا ہے۔ اس کا قانون سب سے برتر اور سب پر محیط ہے، انسان اس کا خلیفہ (Vicegerent) ہے[1] اور وہ انسانی افراد میں سے بادشاہ اور حکام مقرر کرتا ہے جن کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ قانون کے مطابق عدل کریں اور کبھی اپنے نفس کے اتباع میں راہ راست سے نہ ہٹیں[2]۔ یہ تعلیم ہے قرآن کی۔ یہ بے غرض، بے لاگ، بے نفسانہ انصاف کا انتہائی نصب العین ہے، جس نے زمانہ گذشتہ کے طریق عدالت و حکمرانی کو قطعی طور پر رد کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ایسے دور کا جس میں اس قسم کے عدل کو رعیت کا سب سے زیادہ مقدس حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

بے نظمی سے نفرت بہت کم ایسی چیزیں ہیں جن کو قرآن فتنہ و فساد اور بد نظمی سے بڑھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ یہ چیز جو انسانی جماعت کے سیاسی وجود کے لیے گھن کا حکم رکھتی ہے، اس کی برائی کا ذکر اور اس کے استیصال کا حکم قرآن میں جگہ جگہ نہایت کثرت سے آیا ہے۔ ابتدا ہی میں جب خدا اپنے خلیفہ کی حیثیت سے انسان کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بڑا شبہہ جو ملائکہ کے نفوس میں خلش پیدا کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا[3]۔ پھر دیکھیے۔ خدا بنی اسرائیل سے میثاق لیتا ہے کہ وہ خونریزی نہ کریں گے اور نہ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالیں گے[4]۔ یہ فہمائش متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہے[5] غالباً اس لیے کہ انسان

---

[1] وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ۔ (النمل ۵)۔ [2] يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (ص : ۲)۔

[3] وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (بقرہ : ۴)

[4] وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ (بقرہ : ۱۰)۔

[5] مثلاً سورہ عنکبوت میں ہے وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (رکوع ۴)

اور انسان کے درمیان جو فطری عداوت ہے اُس کو دفع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے[1] فتنہ و فساد کو قتل سے زیادہ بُرا کہا گیا ہے[2] اور جو لوگ اس کے محرک ہوں وہ خدا کی لعنت کے مستحق ٹھیرائے گئے ہیں[3] اور سلطنت کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر ممکن ہو تو ان کا زور توڑنے کے لیے پرامن طریقے سے کوشش کرے اور ضروری ہو جائے تو بزورِ شمشیر ان کی جڑ کاٹ پھینکے۔[4] جو لوگ سیاسی اضطراب برپا کرتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرنی چاہیے بلکہ ان کو یا تو قتل کر دینا چاہیے یا سلطنت کے حدود سے خارج کرنا چاہیے۔[5] کیونکہ ان کا فعل دراصل خدا اور رسول کے خلاف جنگ کے مترادف ہے[6] ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو اپنا اور اپنی نسل کا وطن بنایا تو پہلی دعا جو انہوں نے اپنے خدا سے مانگی، یہ تھی کہ اس کو امن اور خوشحالی کا گھر بنا دے[7]۔ اسلامی نظم اجتماعی کی کامیابی کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر بھی یہی بتایا گیا ہے کہ اس نے ان لوگوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے[8]۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ بالکل متحد ہوں

---

[1] قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (طٰہٰ : ۷)۔ [2] وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (بقرہ : ۲۷)

[3] فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ (محمد : ۳)۔ [4] وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (الانفال)

[5] وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء)

[6] إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدہ)

[7] وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا ... فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ (ابراہیم)

[8] وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران)

(وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا) ایک دوسرے پر مہربان (رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ) اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن کر رہیں (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ) ورنہ ان کا انجام بھی انہی باغیوں کا سا ہوگا جو اپنے دعودں میں خواہ کتنے ہی صلح پسند اور امن جو ہوں، مگر دراصل ہر فتنے اور ہر فساد کی جڑ وہی ہیں۔[1]

اسلام کے اصول جنگ، جن کی تشریح، منجملہ دوسرے مقامات کے، سورۂ بقرٰی کی چند مسلسل آیات میں کی گئی ہے دراصل فتنہ و فساد کی اسی مخالفت پر مبنی ہیں۔ وہاں صاف طور پر یہ بتادیا گیا ہے کہ جنگ صرف ان کے خلاف کی جائے جو سلطنت کے خلاف جنگ کریں کیونکہ اندرونی فتنہ قتل سے زیادہ بُرا ہے، اور تلوار اسی وقت نیام میں کرلی جائے جس وقت مفسدین اپنی فتنہ پردازی سے باز آجائیں، اور خدائی قانون کی برتری ازسرنو قائم ہوجائے۔[2]

امن اور اطاعت | اس قاعدہ کا اطلاق، قرآن مجید کی عین روح سے مطابقت رکھتا ہے جن بنیادی تعلیمات کو داعی اسلام نے پیش کیا ہے انھیں صرف دو اصطلاحوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے:۔ ایمان اور اسلام۔ ایک کے مفہوم میں "امن کی حکومت" آجاتی ہے، اور دوسرے کا عین مفہوم ہی "اطاعت" ہے۔ یہ ٹھیک اس تصور کے مطابق ہے جس کو فرمانروائی (Sovereignty) کا جدید تصور سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مرکزی اقتدار کی اطاعت کے بغیر کوئی سلطنت جو سلطنت کہلانے کی مستحق ہو، وجود میں نہیں آسکتی مزید برآں جبکہ خدا کے قانون کو محیط الکل اور بالاتر تسلیم کرلیا گیا، تو یہ بالکل ایک طبعی بات تھی کہ انسان کو اسی قانون کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا حکم دیا گیا جو خدا کی طرف سے پیغمبر اسلام پر بذریعہ وحی

---

[1] وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ (بقرہ: ۲)۔

[2] ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ رکوع ۲۴۔

منکشف ہوا تھا[1]۔ منکرین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ نام نہاد قانون جو اُن کے آبا و اجداد سے ان کو ملا ہے، کوئی صحیح اور مناسب قانون نہیں ہے، کیونکہ اس کے بنانے والے کافی دانشمند نہ تھے اور قانونِ کلی کے متعلق ان کا علم اس قدر ناقص تھا کہ وہ راہ راست نہ پا سکتے تھے[2]۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ان کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو ان کو اسی قانون کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس کی تشریح پیغمبر اسلام نے کی ہے، اس میں ہر وہ چیز ان کو مل جائیگی جس کی انھیں ضرورت ہے[3]۔ اس قانون کے لیے محض ایک منفعلانہ اطاعت (Passive obedience) ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے متبعین پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا ہے کہ خدا کی زمین پر اس کو پھیلانے کی کوشش کریں اور اس کام میں اگر ضرورت پڑے تو اپنا سب کچھ قربان کر دیں، مصیبتیں برداشت کریں، بھوک اور خوف اور تنگی و سختی کا مقابلہ[4] کریں، اور صبر و ثبات کے ساتھ ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کریں[5]۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے

---

[1] وَاَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (آل عمران، ۱۴) يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (الانفال، ۳) فَاِنْ تُطِيعُوا اللّٰهَ يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيمًا (الفتح: ۲) مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسآء: ۱۱)

[2] وَاِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُوْنَ (بقرہ: ۲۱)۔

[3] فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيلًا (النسآء، ۸)

[4] وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (البقرہ: ۱۹)

[5] لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (النسآء، ۱۳)

کہ اس قاعدہ کی سب سے زیادہ پیروی خود اس کے معلم ہی نے کی۔ آپ کی مکی زندگی کے مصیبت بھرے ۱۳ سال، مخالفین کی ایذا رسانی، سنگ باری ظلم و ستم اور سازشوں کے مقابلے میں بسر ہوئے، آخر کار آپ کو اپنے سچے دوستوں کے ساتھ جو آپ کی ذات میں نیکی و شرافت کا ظہور مجسم دیکھ رہے تھے، مکہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر ہمیشہ کے لیے ہجرت کرنی پڑی۔

فرد اور جماعت | قرآن انسانی ضروریات کا نہایت صحیح اندازہ کرتا ہے جب وہ منجملہ دوسری باتوں کے اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ قانون خداوندی کے اس قاعدہ کی پیروی میں یہ زبردست قربانیاں اگرچہ انفرادی حیثیت سے اشخاص کے لیے کتنی ہی ناگوار اور نامرغوب ہوں، لیکن اس کے باوجود ان کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ مآل کار میں ان کا نتیجہ جماعت کی بھلائی ہے[1] یہ درحقیقت اشارہ ہے اس لازمی منافات کی طرف جو شخصی ضروریات اور اجتماعی ضروریات کے درمیان پائی جاتی ہے، اور جس کی بنا پر اجتماعی مفاد کے لیے بسا اوقات یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اشخاص کی جان مال اور ہر وہ چیز جس کو ایک شخص دنیا میں عزیز رکھتا ہے قربان کر دی جائے۔ اسی اصول کو ایک دوسرے موقع پر قرآن اس طرح بیان کرتا ہے کہ قصاص میں ایک شخص کی موت درحقیقت پوری جماعت کی زندگی ہے[2]۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس جماعت کے بغیر جان کے تحفظ کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی عام تشریع (Legislation) صرف ایسے جرائم تک محدود نہیں ہے جیسے قتل اور چوری،[3] یا قصاص اور دیت کا وہ قانون جس نے انتقام کے خوگر عرب قبائل کو ایک قوم بنانے اور مختلف نسلوں اور قوموں کو خدائی قانون

۱ه کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُمۡ وَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ (البقرہ: ۲۱۶)

۲ه وَلَكُمۡ فِى الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِىۡ الۡاَلۡبَابِ (البقرہ: ۲۲)۔

۳ه اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَيۡدِيَهُمَا (المائدہ: ۶)

کے تحت ایک ملت اسلامی بنا دینے میں بہت مدد دی ہے، بلکہ وہ شہادت کے وسیع اصول اور قانونی انتقال املاک کے قاعدے بھی وضع کرتا ہے، جیسے وہ قاعدہ جس کے تحت یہ حکم دیا گیا ہے کہ قرض اور ایسے ہی دوسرے مالی معاملات کو تحریر میں لانا چاہیئے[1] نیز یہ ضروری نہیں کہ روزمرہ کے معاملات خرید و فروخت یا قول و اقرار کے لئے بھی تحریر ہو بلکہ دو گواہ اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایک معاملہ فی الواقع ہوا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نہ صرف ایسے قدیم زمانہ میں جیسا کہ ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ حیات ہی میں اصول قانون نے اس قدر زبردست ترقی کی، بلکہ جو ترقی یافتہ اصول اس وقت وضع کیے گئے تھے انہوں نے قانون کے اُن عمومی تصورات پر بھی ایک پائدار اثر ڈالا جو آج اس جدید زمانے میں رائج ہیں۔

عدل | یہاں پہنچ کر ہماری توجہ خود بخود عدل و انصاف کے اس مسلک کی طرف منعطف ہو جاتی ہے جس کو قرآن کے تجویز کردہ نظام میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ رسالت کی عین بنیاد ہی قرآن کے بیان کے مطابق انسان اور انسان کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ قدیم زمانہ میں شرائع اور کتب آسمانی کے ساتھ انبیاء کی بعثت اسی لیے ہوئی تھی کہ لوگوں کے باہمی اختلافات کا صحیح فیصلہ کریں[2] پیغمبر اسلام اعلان کرتے ہیں کہ ان کو ٹھیک عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے[3] حکام اور قضاۃ کو سختی کے ساتھ ہدایت کی گئی ہے کہ انصاف پر قائم

---

[1] یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ۔ (البقرہ : ۳۹)

[2] فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ (بقرہ : ۲۶)

[3] وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (الشوریٰ : ۲)۔

رہیں اور اپنے ذاتی رجحانات اور تعلقات اور اپنی محبت و نفرت کو انصاف میں دخل نہ دیں[1]
گواہوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ پورا پورا حق ظاہر کریں اور اپنی شہادت میں کچھ نہ چھپائیں[2]
اس کے ساتھ بقائے امن کے لیے یہ قاعدہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ جو شخص کسی پر جھوٹا الزام لگائے
اس کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے[3]۔ یہ ایسے اصول ہیں جو ہر نظام عدل و قانون کے لیے
زینت بخش ہوں گے، خواہ وہ کسی بنیاد پر قائم ہو، اور جو کوئی تعصب سے خالی الذہن ہو کر ان
غور کرے گا وہ تسلیم کرے گا کہ یہ ایسے اصول کلیہ ہیں جن کا اطلاق تمام جہان کے معاملات پر
ہو سکتا ہے۔

اصلاح تمدن اور سیاسیات اس مضمون کے دائرہ میں ان تمام تمدنی اصلاحات کو بیان کرنا
مشکل ہے جو قرآن نے ایک ایسی سوسائٹی میں انجام دیں جو قبیلہ کی حدود سے باہر کسی حق اور
کسی فرض سے آشنا نہ تھی۔ جو چیز قطعی ناممکن معلوم ہوتی تھی اس کو قرآن نے اس طرح پورا کر دکھایا کہ
جو ایک دوسرے کے دشمن تھے ان کو بھائی بھائی بنا دیا، جن دلوں کو نفرت و عداوت نے
پھاڑ دیا تھا ان کو الفت و محبت سے جوڑ دیا، اور جو ہاتھ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔
ان کو برادرانہ تعاون کے رشتہ میں باندھ دیا[4]۔ قرآن ان سب لوگوں کو جو خدائی قانون

---

[1] یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ (المائدۃ : ۲) اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء)

[2] وَلَا تَکْتُمُوا الشَّھَادَۃَ وَمَنْ یَّکْتُمْھَا فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ (البقرہ : ۳۹)۔

[3] اَلَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَھُمْ شَھَادَۃً اَبَدًا (النور)

[4] وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا۔ (آل عمران : ۱۱)۔

کی اطاعت قبول کریں، سختی کے ساتھ ہدایت کرتا ہے کہ اللہ کی رسّی کو مضبوط تھامے رہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں[۱]۔ نیز وہ اُن کو تعلیم دیتا ہے کہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت کریں، اور برے کاموں میں نہ صرف معاونت سے انکار کردیں، بلکہ جو لوگ اس طرف مائل ہوں اُن کو بھی روکیں[۲]۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ ہر اُس چیز کی تحریک وتائید کریں جو نیک ہو اور ہر اُس چیز کو روکیں جو بری ہو[۳]۔ اصلاح تمدن و معاشرت میں قرآن کی ہدایات نہایت مفصل ہیں حتّٰی[۴] کہ وہ ان تفصیلات میں بھی جاتا ہے کہ جو شخص کسی کے مکان میں داخل ہونا چاہتا ہو اس کا فرض ہے کہ پہلے صاحب مکان سے اجازت لے لے، گھر کے لڑکے بھی خاص مواقع پر جبکہ تم کو تخلیہ کی ضرورت ہوتی ہے بلا اجازت تمہارے پاس نہ آئیں[۵]۔ تاجروں کو تاکید کی گئی ہے کہ ناپ تول میں سخت احتیاط برتیں اور اشیاء کو فروخت کرتے وقت معیاری اوزان اور پیمانے استعمال کریں[۶]۔ چوری، زنا، قتل اطفال، اور بہتان و افترا کے استیصال پر خاص توجہ کی گئی ہے[۷]۔ اور ایسی ہی سینکڑوں تمدنی اصلاحات

---

۱ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۱۱)۔ ۲ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ: ۱) ۳ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۲)۔ ۴ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا (النور: ۴) ۵ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ .... وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۸)۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آج ان اصولوں کو خود غیر مسلم اہل مغرب نے اپنی تہذیب میں اختیار کرلیا ہے۔

۶ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ (ھود: ۸)۔ ۷ بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں سے احتراز کا عہد لیا گیا تھا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ عورتوں سے بھی بیعت لیتے وقت ان چیزوں سے پرہیز کا اقرار کرائیں (الممتحنہ ۲:)

اس کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں، اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ ان کو محض تخیلات کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُن عربوں سے جو فخر و غرور کے نشہ میں سرشار تھے اِن کے مطابق عمل کرا کے چھوڑا گیا، اور اس طرح جو لوگ پہلے محض وحشی گلہ بان تھے ان کو تہذیب کے ایسے بلند مرتبہ پر پہنچا دیا گیا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے مدبر، سپہ سالار، حاکم، تاجر، اور عصائے سیاست کے مالک بن گئے، حتیٰ کہ ان قوموں سے بھی آگے نکل گئے جو ہزار ہا سال کی پرانی تہذیب کے مالک ہونے پر فخر کرتے تھے۔

شوریٰ اگرچہ قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ وہ وحی خداوندی اور کشف اسرار و حقائق ہے، لیکن اس کے باوجود قرآنی سلطنت میں شوریٰ کے لیے ایک جگہ اور بہت ہی اہم جگہ ہے جہاں اچھے مسلمانوں کی خصوصیات چند نہایت عمدہ آیتوں میں بیان کی گئی ہیں، جہاں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہیں، جہاں فواحش اور کبائر سے اجتناب پر ان کی تعریف کی گئی ہے، جہاں ان کی بہادری و شجاعت اور اپنے حقوق کے دفاع میں ان کی شہامت کو سراہا گیا ہے وہیں ان کی یہ خصوصیت بھی مدح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں باہم مشورہ کرتے ہیں (وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ) یہی نہیں بلکہ جہاں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب وہ کسی امر کا عزم کرلیں تو خدا کے بھروسہ پر اس کو کر گذریں وہیں آپ کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ مسلمانوں حتیٰ کہ منافقوں تک سے مشورہ لے لیں[1]۔ یہ وہ ٹھیک ٹھیک جمہوری اسپرٹ ہے جس میں صرف تعداد آراء کا ہی نہیں بلکہ رائے دینے والوں کی اہلیت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، جس نے قرآن کے مذہب کو تمام دنیا پر چھا جانے کے قابل بنا دیا۔ اگر اسکے الفاظ اور اسکی اصطلاحات کثرت سے نہیں پھیلیں تو کیا ہوا۔

---

[1] فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۱۷)۔

اس کے پیش کردہ اصول تو دنیا بھر میں قبول کر لیے گئے۔ اسی اسپرٹ کا مزید اظہار ان اصولوں سے ہوتا ہے جو قرآنی محاصل (Taxation) کی بنیاد ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام نے خود جیسی سادہ زندگی بسر کی اس کے لحاظ سے قرآن کے تجویز کردہ نظم حکومت کو چلانے کے لیے بہت کم محاصل کی ضرورت تھی، اور وہ ہر زمانے کے لیے ایک ایسی حکومت کا بہترین نمونہ تھا۔ جو ایک طرف نہایت اعلیٰ درجہ کی کارپرداز (Efficient) ہو اور دوسری طرف کم سے کم مصارف پر چلائی جائے۔ قرآن میں جن محاصل کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

(۱) زکوٰۃ، جو ہر صاحب نصاب مسلمان کی سالانہ بچت میں سے بحساب ۲½ فی صدی لی جاتی ہے۔

(۲) جزیہ، جو غیر مسلم رعایا پر فوجی خدمت سے استثناء کے معاوضہ میں عائد کیا جاتا ہے۔

(۳) خراج یعنی زمین کا لگان۔

ان کے علاوہ جنگ کے انفال اور غنائم ہیں جن کو مستقل ذرائع آمدنی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ زکوٰۃ اور غنائم کے لیے قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ ان کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ مال ایک جگہ جمع نہ ہونے پائے بلکہ سوسائٹی کے مفلس طبقوں میں پھیل جائے۔ ان میں سے صرف ایک حصہ حکومت کے نظم و نسق کے لیے مقرر کیا گیا ہے[۱]۔ باقی مصارف کے لیے حکومت کو دوسرے ذرائع آمدنی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

بین الاقوامی معاملات قرآن کی جامعیت اور مسائل حیات پر اس کی احاطت کا صحیح اندازہ

---

[۱] اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (التوبہ: ۸)۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال: ۵)۔

ہم کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم بین الاقوامی معاملات، قوانین جنگ، سفارتی تعلقات اور معاہدات کے متعلق اس کے قوانین پر نظر کرتے ہیں۔ یہاں اس مبتذل الزام کی تردید میں کچھ کہنا بے محل ہوگا جو اسلام پر لگایا جاتا ہے کہ اس کی اشاعت تلوار سے ہوئی ہے، کیونکہ ایسے امور پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم اپنی گفتگو کو صرف ان ہدایات تک محدود رکھیں گے جو قرآن نے عام بین الاقوامی تعلقات کے باب میں دی ہیں۔ پہلا قاعدہ جو پیغمبر اسلام پر وحی کیا گیا، یہ تھا کہ جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی کہ مسلمانوں پر ان کے مخالفین نے زیادتی کی ہے[۱]۔ اور جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے جنہوں نے ظلم کیا ہے[۲]، اور اس وقت تک کی جائے کہ فتنہ باقی نہ رہے[۳]۔ اور اگر دشمن صلح کی درخواست کرے تو اس کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا جائے[۴]۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ مسلمان کسی حال میں تا نون کلی کے دشمنوں سے موالات کریں۔ جب ان سے جنگ کا اعلان ہو جائے تو انہیں کوئی پناہ نہ دی جائے تاوقتیکہ ان کا زور ٹوٹ نہ جائے[۵]۔ مجاہدین جو ہر اس چیز کی مدافعت پر مامور ہیں جسے وہ مقدس اور عزیز سمجھتے ہیں، بہترین اجر کے امید وار بنائے گئے ہیں[۶]۔

---

[۱] اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: ۶)
[۲] لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ (الممتحنہ ۲)
[۳] وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ: ۲۴)
[۴] وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال: ۸)۔
[۵] يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً۔ (التوبہ: ۱۶) فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔ (محمد: ۱)
[۶] فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء: ۱۰)

اس موقع پر یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وحی کی ہدایت سے غیر مسلموں کی دو جماعتوں میں فرق کیا گیا ہے، ایک جماعت وہ ہے جو متبعین اسلام سے کوئی معاہدہ کرے اور اس پر قائم رہے اس کے ساتھ عہد پورا کرنے کا حکم ہے۔ اور مسلمانوں کو سخت تاکید کی گئی ہے کہ کسی حال میں عہد شکنی کا ارتکاب نہ کریں۔ دوسری جماعت وہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ عہد کر کے اسے توڑ دے اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس سے آخر وقت تک لڑنے کا حکم ہے[1]۔

جب ہم اُن فیاضانہ مراعات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو قرآن نے اسیران جنگ کے ساتھ برتنے کی ہدایت کی ہے تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب نے انسانی سوسائٹی کی سیرت کو بلند کرنے میں کس قدر نمایاں کام کیا ہے۔ جنگ بدر پہلی جنگ ہے جس سے اس قاعدہ کی ابتدا ہوئی کہ اسیران جنگ کو نہ صرف زندہ اور آرام رکھا جائے بلکہ ان کو ایک قلیل معاوضہ پر چھوڑ بھی دیا جائے، خواہ وہ زر فدیہ ہو یا کوئی ایسی مفید خدمت جیسے بچوں کو پڑھنے لکھنے کی تعلیم دینا[2]۔ وہی عرب جن کے مرد تو مرد، عورتیں تک زخمیوں اور مقتول لاشوں پر بھی رحم نہ کھاتی تھیں[3] چند سال کے اندر اس قدر مہذب اور شریف طینت بنا دیے گئے کہ جب پیغمبر اسلام

---

۱ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ..... وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ..... اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ..... وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ..... فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ..... كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ..... وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (التوبہ: ۱-۲۰)

باقی حاشیہ صفحہ آئندہ

اپنے دس ہزار جان نثاروں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید احکام کی اطاعت میں انہوں نے ان ظالموں میں سے کسی کو ہاتھ تک نہ لگایا جنہوں نے آٹھ سال پہلے انہیں اسی شہر سے سخت ظلم وستم کے ساتھ نکالا تھا۔[۱]

رواداری اب ہم رواداری کے اس عظیم قاعدے کی طرف آتے ہیں جس کی نہایت بلند مرتبہ تعلیم قرآن نے دی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی یہ ساتویں صدی عیسوی کا ہی زمانہ تھا، اور دنیا اس زمانہ میں مذہبی اعتقادات میں رواداری کے اصول سے قطعی ناآشنا تھی۔ جیساکہ ہم اس مقالہ کے ابتدائی حصہ میں بتا چکے ہیں اسی زمانہ میں بازنطیم اور ایران کی عظیم الشان سلطنتیں اپنی رعایا کو جبراً اپنے مذہب کا پیرو بنانے کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھیں جو ان کے امکان میں تھا۔ بلکہ ابھی اس کے کئی صدی بعد بھی دنیا کو حروب صلیبیہ، اور جرمنی اور دوسرے ممالک کی مذہبی لڑائیوں اور اسپین کی مذہبی عدالتوں (Inquisition) اور سِسلی اور دوسرے ممالک فرنگ کے جبری تبدیل مذہب، اور انگلستان میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی خون آشامیوں کے دور سے گذرنا تھا۔ پس درحقیقت اصول سیاست کی تاریخ میں یہ ایک نرالی اور حیرت انگیز چیز تھی کہ قرآن نے انسان کے مذہبی معتقدات میں اختلاف اور گوناگونی کو بطور ایک ناقابل تبدیل حالت کے تسلیم کر لیا، اور اس مسئلہ کی بنیاد پر ہر زمانہ کے لیے یہ عظیم الشان قاعدہ کلیہ مقرر کر دیا کہ مذہب کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ [۱] قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ (الانفال ۸-۱۰) [۲] ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جنگ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کا پیٹ چاک کیا اور ان کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالا۔ دیکھو ابن ہشام جلد ۲۔ صفحہ ۵۵۵)

حاشیہ صفحہ ہذا۔ [۱] فتح مکہ کے حالات میں ملاحظہ ہو ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸۰۲)۔

معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہ ہونا چاہیے[1] جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ فرعون کے سامنے نرمی کے ساتھ تلقین و تبلیغ کریں[2]۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص ان کا ہم مذہب نہ ہو اس کے سامنے تبلیغ دین میں نہایت شائستہ اور نرم طرز کلام اختیار کریں[3]۔ یہ خیال رہے کہ اس اصول کی تعلیم اس شخص کی زبان سے دی گئی ہے جو خود مذہب ہی کی وجہ سے ہر قسم کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنایا جا رہا تھا! اس نے کہا کہ اگر آبادی کا صرف ایک حصہ اس دین کو قبول کرے جو مجھے اور میرے متبعین کو سب سے بڑھ عزیز ہے تو دوسرے حصہ کی روش کے متعلق میں نہایت صبر کے ساتھ خدا کے فیصلے کا انتظار کروں گا[4]۔ اگرچہ مسلمانوں کو ایسے لوگوں کی دوستی سے منع کیا گیا ہے جو مخالف کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں یا اپنی روش میں منافق ہیں[5] لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن ان میں اور ایسے لوگوں میں فرق کرتا ہے جو غیر مذہب کے تبع ہونے کے باوجود اپنے پیشواؤں کی تعلیم کے مطابق منکسر اور حلیم الطبع ہوں جیسے کہ اس زمانہ کے بعض عیسائی تھے کفار مکہ سے ایک

---

[1] لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ ۳۴:) وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ (قٓ: ۳)۔

[2] فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ۔ (طٰہٰ: ۲)۔

[3] اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۶)

[4] وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا (الاعراف: ۱۱)

[5] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ (آل عمران: ۱۲)

[6] وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔ (المائدہ: ۱۱)۔

پوری سورۃ میں خطاب کیا گیا ہے اور اس کا اختتام اس قاعدۂ عظیم وجلیل پر ہوتا ہے جو ان کے سامنے پیش کیا گیا کہ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ اب یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ اس مصالحانہ قاعدہ کی تعلیم کے بعد سے تمام دنیا کے مذہبی افکار کا میلان اسی کے کلی اطلاق کی طرف ہو گیا ہے، لیکن ہمارے اس جدید دور میں بھی دنیا کے متعدد علاقے ایسے موجود ہیں جو مذہبی جبر وظلم کی قدیم وحشیانہ اسپرٹ کا اظہار کر رہے ہیں، اور ایک ہی ملک کے باشندوں کو جو ایک ہی زبان بولتے ہیں محض اس لیے دھکے دیے جاتے ہیں کہ اتفاق سے وہ اس مذہب کے معتقد نہیں ہیں جو اکثریت کا مذہب ہے[۱]۔

بین الاقوامیت | بین الاقوامیت کا اصول وہ آخری اصول ہے جس کی میں یہاں تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن مجید کے اصول جس زمانہ میں تعلیم کیے گئے وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا متحارب قوموں، فرقوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس حالت میں قرآن نے انتہائی بین الاقوامیت کی تعلیم دے کر ایک بالکل نئی چیز دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ ایک غایت درجہ کا بے باکانہ اقدام تھا، مگر یہ اسی قسم کے اقدامات میں سے تھا جن کا اظہار قرآن مجید نے اپنے دوسرے اصولوں کی تعلیم میں کیا ہے۔ بلاشبہ قرآن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان طبقات میں منقسم ہیں اور درجات کی کمی وبیشی حق بجانب ہے تاکہ شخصی قابلیتوں کو آزمائش کا پورا موقع مل سکے[۲]۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ فرقوں اور باہم جنگ کرنے والے عناصر

---

[۱] آج اس روشن زمانہ میں نازی جرمنی کا یہی حال ہے۔

[۲] هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (الانعام: ۲۰)
اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (بنی اسرائیل)۔

کا وجود دراصل قانون الٰہی سے انحراف اور تجاوز کر جانے کی سزا ہے۔[1] جتنے شعوب وقبائل دنیا میں موجود ہیں، اپنی طبیعی اصل کے اعتبار سے یکساں ہیں، اور ان کے امتیازی خصائص کا بقا صرف اس غرض کے لیے دُرست ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان تمیز ہو سکے۔ باقی رہی فضیلت اور شرافت و بزرگی تو قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ کسی نسل، کسی قبیلے، کسی خاندان اور کسی قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اعلیٰ سیرت اور نیک کردار کی بنا پر ہے۔[2] جس شخص نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن[3] کی شادی ایک غلام سے کر دی، جو شخص ایک غلام زادے[4] کو اشراف قریش کی فوج کا سپہ سالار بنا سکتا تھا، جو شخص اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں اپنی قوم کے ایک نہایت غریب آدمی کی سی زندگی بسر کر سکتا تھا، جس کے دل میں کمزوروں اور پست حال لوگوں کی بھلائی کے سوا کوئی اور خیال نہ تھا، ایسے شخص کا طرز عمل خود ہی پرانی حد بندیوں کی شکست کا ایک زندہ نمونہ تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ بین الاقوامی تخیل کے حامیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نسل، زبان اور جغرافی تقسیموں کی بظاہر ناقابل عبور حد بندیاں ہیں۔ اور تخیلات خواہ کتنے ہی مقدس ہوں، مگر انسان اپنے روز افزوں ذرائع کے باوجود آج تک ان رکاوٹوں

---

[1] اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (الانعام: ۶۵)۔

[2] يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۔ (الحجرات: ۲)

[3] حضرت زینب بنت جحش، عبد المطلب کی نواسی جن کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ کر دی تھی۔

[4] سریۂ موتہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ کو اس فوج کا سپہ سالار بنایا جس میں اکابر صحابہ شریک تھے۔

پر غالب آنے اور ان تصورات کو حقیقت بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے جن کا اشتہار "انسان کی پارلیمنٹ اور عالمگیر وفاق" کے دل خوش کن عنوانات سے وہ بڑے زور شور کے ساتھ دے رہا ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام نے نوع انسانی کو ایک راستہ دکھایا، قانون کلی کا راستہ، جس کو نسل وطن زبان اور جغرافی اشکال کی تمام شدید حد بندیوں کے باوجود تمام انسان قبول کر سکتے ہیں[۱]، اور آپ نے خود روم، حبش، فارس اور عرب کے لوگوں کو اس قانون کی اطاعت میں جمع کرکے نہ صرف ایک بلند تخیل پیش کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنا کر بھی دکھا دیا، جس کی نظیر آج تک کوئی دوسرا انسان پیش نہ کر سکا[۲] صلی اللہ علیہ وسلم۔

۱ے اس خاص مسئلہ کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ ترجمان القرآن (حیدر آباد) جلد سوم بابت ماہ رجب و شعبان ۱۳۵۲ھ

۲ے قانونی افکار پر اسلام کے اثرات کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو The Legacy of Islam
De Santillana میں پروفیسر Clarendon Press. Oxford 1931.
کا مضمون (Law and Society)